...... بنا کے تقدیر کا بہانہ!

علامہ حمید الدین فراہیؒ ہمارے دور کے ان ممتاز علماء میں سے ہیں جنہوں نے قرآن فہمی کی صحیح طرح ڈالی۔ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے محاورۂ عرب لاینفک ہے۔ محاورۂ عرب سے مراد یہ ہے کہ قرآنی الفاظ (مفردات) کے وہ معانی لئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن کے عرب مخاطبین لیتے تھے۔ یہ طریقِ تحقیق عربی ادب پر وسیع اور گہری نگاہ رکھنے کے علاوہ بڑا مشکل اور محنت طلب تھا۔ کیونکہ اس کا ذریعہ تحقیق عرب جاہلیہ کے شعراء کا کلام تھا۔ علامہ فراہیؒ نے اس دشوار گذار راستہ میں قدم رکھا لیکن افسوس ہے کہ وہ تھوڑا سا راستہ ہی طے کرنے پائے تھے کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر وہ اس مقصد کو تکمیل تک پہنچا جاتے تو قرآن فہمی کا راستہ بڑا آسان ہو جاتا۔

ان کے تلامذہ میں سرِ فہرست (مولانا) امین احسن اصلاحی کا نام آتا ہے۔ لیکن وہ ان کے مدرسہ (واقع سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ۔ یو۔ پی) کو چھوڑ کر پنجاب کی طرف تشریف لے آئے اور جماعت اسلامی کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ اس جماعت کے زعماء میں مودودی صاحب (مرحوم) کے بعد انہی کا نام سرِ فہرست ہوتا تھا۔ ۱۹۵۶-۵۷ء میں وہ، اس جماعت کے دیگر بلند پایہ ارکان کے ساتھ، یہ کہہ کر جماعت سے الگ ہو گئے کہ

میں نے سولہ سال کے بعد ایک گم کردہ راہ قافلہ کا ساتھ چھوڑا ہے۔

(نوائے وقت۔ مورخہ ۵۸/۱/۲)

ہم نے اسی زمانہ میں لکھا تھا کہ انہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ جس قافلہ کے ساتھ وہ راہ نورد ہیں، وہ گم کردہ راہ ہے، کافی لمبا عرصہ لگا!

جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے بعد وہ کچھ عرصہ، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ہمنوا رہے (شاید اس قدرِ مشترک کی بنا پر کہ وہ بھی جماعت کا ساتھ چھوڑنے والوں میں سے تھے) ڈاکٹر صاحب سے علیحدگی کے بعد وہ (غالباً) گوشہ نشین سے ہو گئے اور اب معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے اسی عرصہ میں قرآنِ مجید کی تفسیر مکمل کر لی ہے جو تدبرِ قرآن کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ہمیں اس کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

تفسیر کی تکمیل کے بعد مولانا صاحب نے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی ہے جس کا نام "ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث" ہے۔ اس کے مقاصد میں (ادارہ کے الفاظ میں) یہ بھی ہے کہ "قرآن کی طرح حدیث پر بھی ایسا تحقیقی

کام جو حدیث و قرآن اور فقہ اسلامی میں ایسی کامل ہم آہنگی واضح کر دے کہ گروہی تعصبات اور فرقہ وارانہ تعصبات کالعدم ہو جائیں۔ اس ادارہ کی طرف سے تدبیر ہی کے نام سے ایک ماہنامہ کا بھی اجرا ہوا ہے، جس کا پہلا شمارہ ہمیں تبصرہ کے لئے موصول ہوا ہے۔ اس ادارہ میں حدیث پر جس انداز سے تحقیقاتی کام کیا جائے گا اس کا آغاز زیر نظر پرچہ سے کر دیا گیا ہے۔ اس کا ذکر ہم ذرا تفصیل سے کریں گے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس موضوع کو سامنے لائیں، بغرض تفہیم ایک تمہید ضروری سمجھتے ہیں۔

دین کی ساری عمارت قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیادوں پر استوار۔ اس قانون سے مراد یہ ہے کہ

(۱) خدا نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا۔

(۲) حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے (بذریعہ وحی) اسے غلط اور صحیح (خیر و شر کے) دونوں راستے دکھا دیئے۔ اور

(۳) اس سے کہہ دیا کہ وہ ان میں سے جو نسا راستہ چاہے اختیار کر لے۔

(۴) اگر وہ شر (برائی کا تخریبی راستہ) اختیار کرے گا تو اس کے تخریبی نتائج اس کے سامنے آجائیں گے (اسے سزا یا عذاب کہا جائے گا) اگر خیر (بھلائی کا تعمیری راستہ) اختیار کرے گا تو تعمیری نتائج کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہوگا۔ (اسے حسنِ عمل کی جزا کہتے ہیں)۔

سلسلۂ رشد و ہدایت۔ انبیاء کرام کی بعثت۔ نزولِ وحی، یہ سب اسی مقصد کے حصول کے لئے ہے کہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ (جزا یا سزا) مل جائے۔ اس میں کسی کی استثنا نہیں۔ حتیٰ کہ خود نبی اکرمؐ نے بھی (وحی کی رو سے قرآن میں) اعلان فرمایا کہ اگر میں بھی (بفرضِ محال) احکام خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مؤاخذہ سے نہیں بچ سکتا۔ ذمہ داری کا یہی احساس تھا جس سے صحابہ کبارؓ (بالخصوص حضرات خلفائے راشدینؓ) کانپتے اور لرزتے رہتے تھے کہ کہیں کوئی ایسی لغزش نہ ہو جائے جس سے وہ مؤاخذہ خداوندی کی گرفت میں آجائیں۔ اس لئے وہ اُمت کو دعوت دیا کرتے تھے کہ وہ اُن کے کردار پر گہری اور کڑی نظر رکھیں اور جہاں کوئی ذرا سی لغزش بھی محسوس کریں انہیں برملا ٹوک دیں تاکہ وہ اپنی اصلاح کر لیں۔

یہ تھا صدرِ اوّل میں قرآنی قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان کا نتیجہ۔

(۲)

صدرِ اوّل کے بعد، خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور دین کا نقشہ (رہی نہیں حلیہ تک) بدل گیا۔ اسلام میں خلیفہ اس سربراہ مملکت کا نام تھا جسے اُمت، اس عظیم ذمہ داری کو سرانجام دینے کے لئے متعین کرتی تھی۔ اس اعتبار سے وہ سب سے پہلے اپنے ہر عمل اور فیصلہ کے لئے اُمت کے سامنے جواب دہ ہوتا تھا۔ اور اس جواب دہی کو اس لئے ضروری سمجھتا تھا کہ وہ قانونِ مکافاتِ عمل کے مواخذہ سے بچ جائے۔ ملوکیت میں ہر شخص جو قوت فراہم کر لے، اُمت کے کندھوں پر سوار ہو جاتا تھا اور جب تک اس کی قوت برقرار رہتی، وہ اور اس کے بعد اس کی اولاد تختِ حکومت پر قابض رہتی۔ قانونِ مکافاتِ عمل کا اسے خیال تک

نہیں آتا تھا ..... اگر اسے اس کا خیال ہوتا تو وہ اس طرح اقتدار پر قابض کیسے ہو جاتا۔ قوت کے زور پر صاحبِ اقتدار بن جانے کو تو خدا کا قانون سنگین ترین جرم قرار دیتا ہے۔ یوں نظامِ حکومت سے اُمّت کا عمل دخل ختم ہو گیا۔ اُمّت محکوم ہو گئی اور خلیفہ (بادشاہ) حاکم۔ اور حاکم بھی مطلق العنان۔

جب قانونِ مکافاتِ عمل کا احساس جاتا رہا، تو پھر بادشاہ ہر قسم کی من مانی کرتا ——— سلب و نہب۔ لوٹ کھسوٹ۔ ظلم و استبداد۔ اُمّت کے حقوق کی پامالی۔ اس کا معمولِ زندگی بن جاتا۔ وہ، وہ اپنی مطلق العنانی کے زور پر سب کچھ کرتا تو رہتا لیکن یہ خیال اُسے ضرور ستاتا کہ اگر ان مظالم سے تنگ آ کر کسی دن قوم اس کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی تو اس سیلاب کا روکنا ناممکن ہوگا۔ وہ اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا۔ جب اس خطرہ کا احساس زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تو (جیسا کہ ہوتا چلا آ رہا ہے) مذہبی پیشوائیت آگے بڑھی۔ اس نے سلاطین سے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ قوم مذہب پرست واقع ہوئی ہے۔ اسے مذہب کے حربوں سے ایسا مفلوج کیا جا سکتا ہے کہ یہ اُٹھنا تو درکنار، ہلنے تک کے قابل بھی نہ رہے۔ اس کے لئے انہوں نے اس عقیدہ کو عام کیا کہ تمام کائنات خدائے مطلق کے حیطۂ اقتدار میں ہے۔ یہاں ایک پتّا بھی اس کے حکم کے بغیر ہل نہیں سکتا۔ جو کچھ ہوتا ہے سب اس کے حکم اور اجازت سے ہوتا ہے۔ انسان کا غلط قدم اٹھانا تو درکنار، وہ آنکھ تک بھی اس کے حکم بغیر نہیں جھپک سکتا۔ انسان مجبورِ محض ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے سلاطین کی مطلق العنانیت اور ڈکٹیٹر شپ، کے مسلک کی تائید، اس آیتِ قرآنی کی غلط تاویل سے کی کہ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ ..... (۳/۲۵) "حکومت خدا کی طرف سے عطا کردہ ہوتی ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے حکومت عطا کر دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے۔" اس ایک عقیدہ سے حکومت سے قوم کا عمل دخل ختم ہو گیا۔ کسی نے خلیفہ سے کچھ کہنے کی جرأت کی تو اس کا جواب موجود تھا کہ مجھے حکومت خدا نے دی ہے۔ تم اس پر اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو؟ تم خدا کے فیصلے کے خلاف سرکشی کرنا چاہتے ہو؟ یہ کفر ہے۔ ارتداد ہے۔ اس کی سزا موت ہے۔

ملوکیت کی ڈکٹیٹر شپ میں ہوتا یہ ہے کہ آج جسے جی چاہتا، مسندِ عالیہ پہ سرفراز کر دیا۔ کل ہی اُسے حوالۂ دار و رسن کر دیا۔ نہ اس ترقی و ارتفاع کے لئے کسی دلیل کی ضرورت۔ نہ اس تذلیل و تعذیب کے لئے سبب بتانے کی حاجت۔

اس یکسر دھاندلی کے حق میں یہ "خدائی سند" پیش کر دی کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ..... (۳/۲۵) عزّت اور ذلّت، سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بادشاہ (بیچارہ) تو محض خدا کا آلۂ کار (INSTRUMENT) ہے۔ خدا جیسا حکم دیتا ہے یہ اس کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف کسی قسم کا احتجاج کیا؟ وجہ پوچھنی ہے تو پتھر مارنے والے سے پوچھو۔ پتھر بیچارہ کیا بتا سکے گا؟

عوام بھوکوں مرنے لگے۔ افلاس اور غریبی نے انہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر رکھ دیا۔ اس کے برعکس وہ

دیکھتے کہ ان کے بچوں کو وہ کچھ نہیں ملتا جو کچھ طبقۂ امراء کے کتوں کو ملتا ہے۔ اس سے اُن کے دلوں میں سرکشی کے جذبات کا اُبھر آنا فطری تھا۔ اسے یہ کہہ کر دبا دیا گیا کہ رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے فقیر بنا دے۔ جسے چاہے امیر۔ اس کے فیصلے کے خلاف کسی کو دم مارنے کی جا نہیں۔

اس طرح ان مستبد جلاّدوں کے ہر حکم اور ہر فیصلہ کے لئے خدائی سند عطا ہو گئی اور ان کے مظالم اور سفاکیت کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد نہ ہونے پائی۔

(۷)

آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ قانونِ مکافاتِ عمل سے متعلق قرآن کریم کی اس قدر واضح اور مفصل تعلیم اور احکام کے خلاف، ان عقائد نے یاد کیسے پا لیا جن سے دین کی بنیاد ہی منہدم ہو گئی۔ اس کے لئے وہی طریق اختیار کیا گیا جو ہر غیر قرآنی عقیدہ و مسلک کو اسلامی قرار دینے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی اس کی تائید میں روایات وضع کی گئیں اور انہیں منسوب کر دیا گیا حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس کی طرف۔ یہ روایات کثیر التعداد ہیں۔ ہم ان میں سے معدودے چند درج ذیل کرتے ہیں۔ (جو احادیث کے نہایت قابلِ اعتماد مجموعہ مشکوٰۃ کے باب القدر سے اخذ کی گئی ہیں) ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ خداوند تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو پیدا کرنے سے، پچاس ہزار برس پہلے، مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا ہے۔ جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ (بحوالہ مسلم)

(۲) حضرت ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسولِ خدا نے ہر چیز تقدیر پر موقوف ہے یہاں تک کہ نادانی اور دانائی بھی۔ (بحوالہ مسلم)

(۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کا ٹھکانا نہ لکھا گیا ہو۔ یعنی یا تو اس کا ٹھکانا آگ میں ہوگا یا جنت میں۔ (بحوالہ بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصہ لکھ دیا ہے وہ ضرور اس پر عمل کرے گا۔ (بحوالہ بخاری و مسلم) نیز حضورؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا۔ پھر اس کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا۔ پھر اس میں سے (یعنی اس کی پشت میں سے) اس کی اولاد نکالی، اور فرمایا۔ پیدا کیا میں نے ان کو جنت کے لئے۔ یہ جنتیوں کے کام کریں گے۔ پھر دوبارہ آدم کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے اور اولاد نکالی۔ اور پھر فرمایا کہ ۔۔۔ پیدا کیا میں نے ان کو دوزخ کے لئے۔ یہ لوگ دوزخیوں کے کام کریں گے۔ رسول اللہؐ کا یہ ارشاد سن کر ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ؟ رسول اللہؐ نے جواب میں فرمایا کہ خداوند تعالےٰ ۔۔۔ جب کسی بندے کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتیوں ہی کے کام کراتا ہے ۔۔۔۔۔ اور پھر اس کے ان اعمال کے سبب اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کسی بندے کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے کام کراتا ہے ۔۔۔۔۔ اور خدا اس کو اس کے کاموں کے سبب

دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔ (بحوالہ۔ مالک۔ ترمذی۔ ابوداؤد)

(۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ باہر تشریف لائے اور آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ آپ نے ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! ہم کو معلوم نہیں۔ آپؐ نے سیدھے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ کتاب پروردگار عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں جنتیوں کے نام ہیں...... اب نہ اس میں کچھ گھٹایا جا سکتا ہے نہ بڑھایا۔ اس کے بعد آپؐ نے اُلٹے ہاتھ کی کتاب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ کتاب بھی پروردگار عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں دوزخیوں کے نام درج ہیں۔ اب اس میں نہ کچھ زیادہ کیا جا سکتا ہے نہ کم۔

(بحوالہ۔ ترمذی)

(۵) حضرت ابوالدرداؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے ہر ایک بندے کے متعلق پانچ باتوں سے فراغت حاصل کر لی ہے۔ یعنی ان پانچ باتوں کو اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ اس کی مدت (عمر) اس کا نیک و بد عمل۔ اس کے رہنے کی جگہ۔ اس کی واپسی اور رزق۔ (بحوالہ احمد)

اس کی بے شمار روایات کتب احادیث میں مروی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص ان روایات پر قرآن کریم اور علم و بصیرت کی رو سے غور کرے گا، اس کے دل میں قسم قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہوں گے اور وہ ان پر اعتراضات کرے گا اور مزید وضاحت کے لئے سوالات بھی کرے گا۔ جن لوگوں نے یہ احادیث وضع کی تھیں انہوں نے، ایسی صورتِ حال سے بچنے کی خاطر پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس قسم کی حدیثیں بھی ساتھ ہی وضع کر دی تھیں۔ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ تقدیر کے مسئلہ پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ رسول خداؐ تشریف لے آئے اور

ان پر بحث اور گفتگو کی ممانعت

ہماری گفتگو سن کر آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اتنا سرخ ہو گیا کہ انار کے دانوں کا پانی آپ کے رخساروں میں نچوڑ دیا گیا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم کو یہی حکم دیا گیا ہے؟ کیا میں تمہارے درمیان اسی لئے بھیجا گیا ہوں۔ تم سے پہلے جو قومیں گذری ہیں جب انہوں نے اس مسئلہ پر مناقشہ کیا تو ان کو ہلاک کر دیا گیا۔ میں تم کو قسم دیتا ہوں اور مکرر قسم دیتا ہوں کہ تم آئندہ اس مسئلہ میں جھگڑا نہ کرو۔ اور کوئی بحث و گفتگو نہ کرنا۔ (بحوالہ ترمذی)

آپ نے غور فرمایا کہ تقدیر کے متعلق خلاف قرآن روایات وضع کرنے والوں نے کس طرح پیش بندی کر دی۔ انہوں نے کہہ دیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ تم سے (تقدیر سے متعلق) جو احادیث بیان کی جائیں، تم انہیں آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لو۔ جس شخص نے ان کے متعلق کسی قسم کی بحث یا گفتگو کی وہ ہلاک ہو جائے گا۔

ان واضعین احادیث نے، اس خیال سے کہ بعد میں لوگ بحث و تمحیص، یا قرآنی احکام و دلائل پر غور و تدبر سے، کہیں اس عقیدہ سے منحرف نہ ہو جائیں، ایک اور گرہ لگا دی۔ یعنی اس عقیدہ کو جزوِ ایمان بنا دیا۔

کن باتوں کے ماننے سے ایک شخص مسلمان ہو سکتا ہے اور کن امور کے انکار کرنے سے وہ کافر ہو

اجزائے ایمان

جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ان کی صراحت کر دی ہے۔ انہیں اجزائے ایمان کہا جاتا ہے اور یہ پانچ ہیں۔ یعنی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ .... (۲/۱۷۷)۔ اللہ۔ ملائکہ۔ انبیاء۔ کتب اور آخرت پر ایمان۔ دوسری جگہ ہے۔ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا ۔ (۴/۱۳۶)۔ جس نے انکار کیا اللہ۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ اور یوم آخرت سے وہ دُور کی گمراہی میں جا پڑا ..... سارے قرآن کریم میں ایمان کے یہی پانچ اجزا بتائے گئے ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اب کسی شخص کو مسلمان تسلیم کرنے کے لئے اس سے کس قسم کا اقرار لیا جاتا ہے؟ اس سے کہا جاتا ہے (اور) شاید آپ سے بھی یہ کہا گیا ہو) کہ کہو۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔

میں ایمان لایا اللہ پر۔ اس کے ملائکہ پر۔ اس کی کتابوں پر۔ اس کے رسولوں پر۔ موت کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے پر۔ اور اس بات پر کہ نیکی اور بدی۔ برائی اور بھلائی۔ نفع نقصان۔ خیر اور شر، سب خدا کی طرف سے مقدر ہو چکا ہے۔

یعنی ایمان کے پانچ اجزا تو خدا نے مقرر کئے تھے۔ اب اس میں چھٹے جزو کا اضافہ کیا گیا — یعنی تقدیر پر ایمان

چھٹے جزو کا اضافہ، تقدیر پر ایمان

کا اضافہ کیا گیا — اب کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ خدا، ملائکہ، کتب، رُسل اور آخرت کے علاوہ، تقدیر پر بھی ایمان نہ لائے۔ اور یہ اضافہ ہوا روایات کی رُو سے۔ مثلاً

(۱) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ بندہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک ان چار باتوں پر یقین نہ رکھے۔ (۱) اس امر کی شہادت دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں خدا کا رسول ہوں۔ مجھ کو خدا نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ (۲) موت کو حق جانے۔ (۳) مرنے کے بعد جی اٹھنے کو سچ مانے۔ اور (۴) تقدیر پر ایمان رکھے۔ (بحوالہ ترمذی۔ ابن ماجہ)

(۲) حضرت ابن دیلمیؒ کہتے ہیں کہ (حضرت) ابن ابی کعب میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ تقدیر کے متعلق میرے دل میں کچھ شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ تم کوئی حدیث۔ بیان کرو تاکہ اس کو سُن کر شاید میرے شبہات دُور ہو جائیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر خداوند تعالےٰ آسمان والوں اور زمین والوں کو عذاب میں مبتلا کر دے تو وہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ ان پر رحم کرے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہرحال بہتر و برتر ہوگی۔ اگر تو احد پہاڑ کے برابر بھی خدا کی راہ میں سونا خرچ کرے تو تیرا یہ عمل جبر اس وقت تک خدا کے ہاں قبول نہ ہوگا جب تک تو تقدیر پر کامل اعتقاد و ایمان نہ رکھے اور تو اس بات کو اچھی طرح نہ سمجھ لے کہ جو کچھ تجھ کو پہنچا ہے وہ

چُوکنے والی اور خطا کرنے والا نہیں تھا۔ (یعنی تجھے اس سے دوچار ہونا تھا)۔ اور جو چیز تجھ کو نہ پہنچنے والی تھی وہ ہرگز ہرگز تجھ کو نہ پہنچتی (یعنی جو کچھ تجھ کو حاصل ہوا وہ تیری سعی کا نتیجہ نہیں بلکہ مقدر میں اسی طرح تھا اور جو چیز تجھ کو نہیں ملی وہ تیری کوشش سے بھی تجھے نہ ملتی، اس لئے کہ تقدیرِ الٰہی یونہی تھی) اگر تو اس اعتقاد کے خلاف اعتقاد رکھے گا (یعنی تقدیرِ الٰہی پر تیرا کامل اعتقاد نہ ہوگا) اور اسی حالت میں تو مر جائے گا تو تو یقیناً دوزخ میں جائے گا۔ ابنِ دیلمیؒ کہتے ہیں کہ ابی ابنِ کعبؓ کا یہ بیان سُن کر میں عبداللہ ابنِ مسعودؓ کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی یہی کہا۔ پھر حذیفہؓ بن الیمان کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی ایسا ہی کہا۔ پھر میں زیدؓ ابنِ ثابت کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی اسی قسم کی حدیث کو رسول اللہؐ سے روایت کیا۔ (بحوالہ۔ احمد۔ ابوداؤد۔ ابنِ ماجہ)

یوں تقدیر کا یہ نظریہ جسے مجوسیوں، نصرانیوں اور یہودیوں سے مستعار لیا گیا تھا، ہمارے ہاں جزوِ ایمان بن گیا ——— ہمارے مذہبی حلقہ میں اس نظریہ نے کس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے اس کا اندازہ

سید سلیمان ندوی مرحوم کی تصریح

اس سے لگائیے کہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے سیرت النبیؐ پر سلسلہ وار مجلدات، شائع کی ہیں۔ اس سلسلہ کی چوتھی جلد میں انہوں نے عقائد سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے، اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور آخرت پر گفتگو کرنے کے بعد "قضا و قدر" کے عنوان سے ایک مستقل باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس کی ابتدا وہ یوں کرتے ہیں:۔

> اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے۔ چنانچہ بعض صحیح حدیثوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار دی گئی ہے۔ (صفحہ ۳۸۶)

کسی نظریہ کے "جزوِ ایمان" قرار پا جانے کے عملی عواقب کیا ہوتے ہیں۔ آپ آج اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے اس کا اندازہ اس وقت لگ سکتا ہے، جب اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہو۔ ان حضرات کا فتویٰ یہ ہے کہ جو مسلمان، اجزائے ایمان میں کسی جزو کا منکر ہو (یعنی وہ اسے اس طرح نہ مانتا ہو جس طرح یہ حضرات کہیں) وہ مرتد ہو جاتا ہے۔ اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ چنانچہ جس زمانے میں ہماری مذہبی پیشوائیت ذی اقتدار تھی مسئلہ تقدیر کے ضمن میں، خونِ مسلم کی جس قدر ارزانی ہوئی، اور جو قتل و غارت گری، اس فتنہ ارتداد" کو دبانے کے لئے روا رکھی گئی، اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔[1]

(۰)

ہم نے اس قدر طول طویل تمہید کی ضرورت، مولانا امین احسن اصلاحی کے زیرِ نگرانی شائع ہونے والے ماہنامہ تدبر کے سلسلہ میں سمجھی تھی، جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس میں حدیث کے متعلق تحقیقاتی مباحث ہوں گے۔ اس تحقیق کی ابتدا جس مقالہ سے کی گئی ہے وہ اس کے صفحہ ۲۲ پر "حدیثِ جبریلؑ" کے عنوان سے درج کیا۔ اس کا اُردو ترجمہ اس میں یوں دیا گیا ہے:۔

---

[1] ہم نے ان تمام مباحث کو پرویز صاحب کی مایہ ناز تصنیف "کتاب التقدیر" سے اخذ کیا ہے۔ اس میں مسئلہ تقدیر پر بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

یحییٰ بن یعمر سے روایت ہے کہ بصرہ میں سب سے پہلے جس شخص نے تقدیر کا انکار کیا وہ معبد الجہنی تھا۔ میں اور حمید بن عبد الرحمان الحمیری حج یا عمرہ کے لئے چلے تو ہم نے باہم یہ مشورہ کیا کہ اگر ہمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی میں سے کوئی صاحب مل گئے تو اُن سے تقدیر سے متعلق لوگوں کے خیالات کے بارے میں دریافت کرنا مناسب رہے گا۔ چنانچہ جب ہمیں عبد اللہ بن عمر رضی، مسجد میں داخل ہوتے نظر آئے تو میں نے اور میرے ساتھی نے انہیں دائیں بائیں سے گھیر لیا۔ مجھے گمان ہوا کہ میرا ساتھی چاہتا ہے کہ بات میں کروں اس لئے میں نے کہا: "ابو عبد الرحمٰن! ہمارے ہاں کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوئے ہیں جو قرآن پڑھتے لیکن اس کے علم سے دھینگا مشتی کرتے ہیں۔" میں نے ان کے مزید حالات سے انہیں آگاہ کیا اور بتایا کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ تقدیر کچھ نہیں اور ہر معاملہ بالکل آغاز سے واقع ہوتا ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی نے کہا: "جب تم ان لوگوں سے ملو تو انہیں بتانا کہ نہ میرا اُن سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کا مجھ سے کوئی تعلق ہے۔ قسم اس ذات کی جس کے نام کی عبد اللہ بن عمر رضی قسم کھاتا ہے، اگر ان میں سے کسی کے پاس کوہ اُحد کی مانند سونا ہو اور وہ اسے (خدا کی راہ میں) خرچ بھی کر دے تو اللہ اس کی عبادت اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ رکھتا ہو گا۔" پھر انہوں نے حدیث بیان کی کہ

ہم اس مقام پر قصداً رک گئے ہیں کہ آپ اس حدیث کو ملاحظہ فرمانے کے لئے ذرا تازہ دم ہولیں۔ تحریر ہے:۔

میرے والد عمر بن الخطاب نے مجھے بتایا کہ ایک دن جب ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھے ناگاہ ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس کے کپڑے بالکل سفید اور بال گہرے کالے رنگ کے تھے۔ اس پر سفر کا کوئی اثر دکھائی نہ دیتا تھا اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہ تھا۔ وہ سیدھا نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے اپنے گھٹنے حضور کے گھٹنوں کے ساتھ جا ٹیکے اور ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ لئے اور کہنے لگا۔ "محمد! مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے؟" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسلام یہ ہے کہ تو یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، تو نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔" اس شخص نے کہا۔ "آپ نے سچ کہا۔" عمر رضی کہتے تھے کہ ہمیں اس شخص پر تعجب ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال بھی کرتا ہے اور آپ کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ اس شخص نے پھر پوچھا۔ "مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے۔" آپ نے فرمایا۔ "ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور تقدیر پر یعنی اچھی اور بُری دونوں پر ایمان لائے۔" اس شخص نے کہا کہ "آپ نے سچ کہا۔" پھر پوچھا۔ "مجھے احسان کی بابت بتائیے۔" حضور نے فرمایا۔ "احسان یہ ہے کہ

تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے کیونکہ اگر تُو نے اسے نہیں دیکھا وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے"۔ اس نے کہا "مجھے قیامت کی اطلاع دیجئے"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ کچھ نہیں جانتا"۔ اس نے کہا۔ "مجھے اس کی نشانیاں ہی بتا دیجئے"۔ آپ نے فرمایا۔ "نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے اور تو ننگے پاؤں، ننگے بدن والے، کنگلے ریوڑ چرانے والوں کو دیکھے کہ وہ عمارتوں میں فخر کر رہے ہیں"۔ عمرؓ نے بتایا کہ پھر وہ شخص چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد حضورؐ مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھا۔ "عمرؓ! جانتے ہو سوال کرنے والا کون تھا"؟ میں نے عرض کی۔ "اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "یہ جبریلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لئے آئے تھے"۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان باب — ما جاء فی الایمان والاسلام وذکر المقدر وغیرہ)۔

ظاہر ہے کہ یہ ساری روایت، تقدیر پر ایمان لانے کے لئے سند کے طور پر وضع کی گئی ہے۔ تقدیر سے مراد کیا ہے، اس کی بابت اسی ماہنامہ (تدبر) میں اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

ایمان بالقدر کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اس امر کا یقین رکھے کہ ہر انسان اپنی زندگی میں جس طرح کے حالات سے دوچار ہوتا ہے، وہ خیر ہوں یا شر، وہ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے اور اس کے لئے ایسا ہونا مقدر ہے۔ زندگی اور موت، بیماری اور صحت، رزق کی تنگی اور فراخی، عزت، ذلت وغیرہ ہر فرد کے لئے پہلے سے طے ہے۔

اب آیئے اس روایت کی طرف۔ روایت وضع کرنے والوں کے متعلق تو کہا نہیں جا سکتا لیکن مولانا اصلاحی جیسے مفسرِ قرآن کی نگاہوں سے تو یہ حقیقت اوجھل نہیں ہونی چاہیئے تھی کہ ملائکہ نظر نہیں آیا کرتے۔ غزوۂ حنین کے سلسلہ میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ... ($\frac{9}{26}$) "اس نے مومنین کی مدد کے لئے ایسے لشکر نازل کئے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے"۔ ذرا آگے چل کر جنگِ بدر کے سلسلہ میں بھی یہی ارشاد ہے کہ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا ... ($\frac{9}{40}$)۔ "اور خدا نے حضورؐ کی ایسے لشکروں سے مدد فرمائی جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے"۔ سورۂ انفال میں ان جنود کو مَلٰٓئِكَة کہہ کر پکارا گیا ہے ($\frac{8}{9}$) نیز سورۂ آلِ عمران میں بھی ($\frac{3}{124}$)۔ (یہ بحث کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت مریمؑ کی طرف ملائکہ انسانی شکل میں آئے تھے، تفصیل طلب ہے۔ ملائکہ کے معنی قاصد یا پیغام رساں بھی ہوتے ہیں۔ جب قرآن کریم نے بہ نصِ صریح کہہ دیا کہ ملائکہ کو (عام انسان تو ایک طرف خود) صحابہ کبارؓ اور حضور نبی اکرمؐ بھی دیکھ نہیں سکتے تھے (لَمْ تَرَوْهَا) تو قرآن کے کسی مقام میں بھی یہ معنی نہیں لئے جا سکتے کہ فرشتے (ملائکہ) انسانی پیکر میں سامنے آیا کرتے تھے۔ جبریلِ امین کو تو قرآن کریم نے بالخصوص اَلرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ($\frac{26}{193}$) اور رُوْحُ الْقُدُسِ ($\frac{16}{102}$) کہہ کر پکارا ہے۔ بنا بریں، یہ تصور ہی غلط ہے کہ جبریلِ امین ایک انسان کی شکل میں مجلسِ نبویؐ میں آ کر بیٹھے تھے۔

وحی یا نبوت کی کنہ وحقیقت سے کوئی غیر از نبی واقف نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی

وحی بوساطت حضرت جبریل، نبی اکرمؐ تک کس طرح پہنچتی تھی۔ قرآن کریم نے اتنا ہی بتایا ہے کہ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ..... (۲/۹۷) جبریل، باذنِ خداوندی، وحی کو قلبِ نبویؐ پر نازل کیا کرتا تھا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ جبریل حضورؐ کے سامنے آکر فریضۂ پیغام رسانی ادا نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ پیغام قلبِ نبویؐ پر القا کیا جاتا تھا۔

پھر اسے بھی پیشِ نظر رکھئے کہ جبریل کا فریضہ خدا کا دین رسول اللہ تک پہنچانا تھا، دین سکھانا نہیں تھا۔ وہ تو صرف قاصد (پیغامبر) تھے۔ دین کے معلم نہیں تھے۔ اس روایت میں اسلام کے متعلق جو کچھ پوچھا اور بتایا گیا ہے وہ [illegible] میں موجود ہے۔ اضافہ صرف "تقدیر پر ایمان" کا ہے۔ اور یہی وہ اضافہ ہے جس کی خاطر یہ تمام قصہ وضع کیا گیا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خلافِ قرآن عقیدہ (جبر) کی اس وقت کیا اہمیت تھی جو تحقیقِ حدیث کے پروگرام کا آغاز اس سے [illegible] ملک میں جرائم پہلے ہی کچھ کم نہیں۔ اس پر جب یہ عقیدہ عام کر دیا جائے کہ مجرم جس جرم کا ارتکاب کرتا ہے اس کیلئے وہ خود ذمہ دار نہیں [illegible] سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے تو پھر اس سیلاب کو روکنے کی کیا صورت ہوگی؟ اگر کسی مجرم نے عدالت (ملکہ شرعی عدالت) میں اپنی مدافعت میں یہ عذر پیش کر دیا کہ خدا کے حکم کے بغیر تو ایک پتا نہیں ہل سکتا، تو میں اس جرم کا ذمہ دار کس طرح قرار پا سکتا ہوں؟ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ عدالت اسے قصوردار کس طرح قرار دے سکے گی؟ اور اگر عدالت نے اسے سزا دے دی تو اس کا یہ فیصلہ "کتاب و سنت" کے خلاف ہوگا۔ اس عقیدہ کی موجودگی میں نہ آئینِ مملکت کی ضرورت رہتی ہے نہ قانونِ حکومت کی۔ نہ پولیس کی ضرورت رہتی ہے نہ عدالتوں کی نہ جیل خانوں کی ضرورت رہتی ہے نہ دار و رسن کی۔ معاشرہ میں انارکی عام ہو جاتی ہے کہ ہر شخص جو کچھ جی میں آئے کرے اور جب اس سے پوچھا جائے تو دھڑلے سے کہہ دے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، خدا کے حکم سے کر رہا ہوں۔ میں اس کی لکھی ہوئی تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

لیکن قرآن کو دین کا مدار اور معیار تسلیم کرنے والے اس قسم کی حیلہ سازیوں کے دامِ فریب میں نہیں آتے۔ جس حضرت عمرؓ کے حوالے سے تدبر میں حدیثِ جبریل نقل کی گئی ہے، اسی (حضرت) عمرؓ کا واقعہ ہے کہ

> ایک چور کو ان کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے چوری کیوں کی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "خدا کا فیصلہ یہی تھا"۔ آپ نے اس پر حد بھی نافذ کر دی اور مزید کوڑوں کی سزا بھی دی۔ جب ان سے اس دوہری سزا کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے کہا کہ حد تو چوری کے جرم کی سزا ہے اور کوڑے اس لئے کہ اس نے خدا کے خلاف جھوٹا الزام لگایا ہے۔ (ابوزہرہ مصری۔ المذاہب الاسلامیہ اردو ترجمہ ص ۱۳۹)

ہم جناب اصلاحی صاحب کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو موقع فراہم کیا ہے تو آپ اس مظلوم قوم کو خدا کی کتاب کی طرف لائیے اور اس جال سے نکالئے جسے کبھی ملوکیت نے اپنی ڈکٹیٹرشپ قائم رکھنے کیلئے بنا تھا۔ اگر وہ بھول گئے ہوں تو ہم انہیں خود ان کے استادِ محترم کا وہ قول یاد دلا دیں جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ

> یاد رہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے ...... حدیث، اجماع اور صحفِ اولیٰ تینوں ظن و شبہ سے خالی نہیں ...... میں نے بعض روایات دیکھی ہیں جو آیتوں کو جڑ سے اکھاڑتی ہیں ...... اکثر اہلِ حدیث کے دلوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ بخاری اور مسلم نے جو کچھ روایت کر دیا اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ پس ہم بعض قابلِ اعتراض مقامات لکھتے ہیں تاکہ تم سمجھ سکو کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو ذب ٹھہرانے کی شفاعت فرمائی ہے۔ ہم ان کے غیر معقول فکر و فہم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں۔ (نظام القرآن)

ہم ایمان لانے کے مکلف صرف خدا کی کتاب پر ہیں۔ وہی دین میں قولِ فیصل اور حرفِ آخر ہے اور وہی روایات کے پرکھنے کا معیار بھی۔